شمس بدایونی

خواتینِ فیضی اور مولانا شبلی نعمانی

پیشِ نظر مضمون راقم الحروف کی مرتبہ و مدوّنہ زیرِ اشاعت کتاب ''خطوطِ شبلی'' از محمد امین زبیری (بار اوّل: بھوپال، ۱۹۲۶ء، دوم: لاہور ۱۹۳۵ء) کے طویل مقدمہ کا حصہ ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

—۱—

خطوطِ شبلی کے مکتوب الیہ عام طور پر دو ہیں، لیکن دراصل یہ تین ہیں:

i۔ عطیہ بیگم فیضی
ii۔ زہرا بیگم فیضی
iii۔ نازلی رفیعہ سلطان بیگم

ان میں زہرا بڑی، نازلی منجھلی اور عطیہ چھوٹی بہن تھیں، لیکن 'خطوطِ شبلی' میں ان کی ترتیب تعدادِ خطوط کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ سطور ذیل میں ان خواتین کے کوائف ان کے خاندانی پس منظر کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں:(۱)

سات جزیروں (old woman's، کولابہ، اپالو بندر، مجگاؤں، سائن، ماہم، ورلی) پر مشتمل بمبئی مسلمانوں کے متعدد ممتاز خاندانوں کی آماجگاہ رہی ہے۔ یہاں کی تہذیبی زندگی میں ان خاندانوں کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان میں کوکنی، بوہرہ اور میمن خاندان بعض نمایاں خصوصیات کے سبب علمی و ادبی تاریخ میں بھی جگہ بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک

بوہرہ سلیمانی خاندان ''خاندان فیضی'' کا سطور ذیل میں تذکرہ کیا جا رہا ہے، جس سے شبلی کا خاص تعلقِ خاطر تھا اور جن کی خواتین، شبلی کی مکتوب الیہ رہی ہیں۔

اس خاندان کا سلسلۂ نسب حاجی بھائی نامی بزرگ سے شروع ہوتا ہے، جو کھمبات (گجرات) کے ساکن تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اِن کے لڑکے بھائی میاں بہ سلسلۂ تجارت بمبئی میں آ کر مقیم ہوگئے۔ یہیں ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے: ۱۔طیب علی [۱۸۰۳۔۱۸۶۳ء] ۲۔فیض حیدر، دونوں کی اولادیں دو الگ الگ ناموں سے متعارف ہوئیں۔ طیب علی کی اولادوں کو ''خاندانِ طیب علی'' کے لقب سے جانا گیا جن کے بیٹے قمر الدین طیب جی [۱۸۳۶۔۱۸۸۹ء] اور بدر الدین طیب جی [۱۸۴۴ء، ۱۹۰۶ء] نے قومی و ملی خدمات کے سبب ناموری حاصل کی۔ فیض حیدر کی اولاد ''خاندانِ فیضی'' کے نام سے متعارف ہوئی۔ فیض حیدر کے اکلوتے فرزند حسن علی فیض حیدر المعروف بہ حسن علی آفندی [۱۸۳۸۔۱۹۰۳ء] تھے،(۲) جو شبلی کے معاصر، شناسا اور زہرا، نازلی وعطیہ کے والد تھے۔

عطیہ کے والد حسن علی بہ سلسلۂ تجارت استنبول میں مقیم تھے۔ وہ متعدد زبانوں سے واقف اور سیاح تھے۔ شبلی نے ۱۸۹۲ء میں جب مصر و شام کا سفر کیا تو ان سے ملاقات کی اور ان کی میزبانی سے متمتع ہوئے۔ شبلی نے 'سفر نامۂ روم ومصر و شام' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔(۳) عطیہ نے انھیں خلفاے دَوَل عثمانیہ کی سرکار میں بلند مرتبے پر فائز لکھا ہے۔(۴) بعض لوگوں نے انھیں ترکی میں حکومتِ برطانیہ کا سفیر(۵) بھی لکھا ہے۔

حسن علی آفندی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی شجاع الدین طیب جی [۱۸۲۹۔۱۸۷۸ء] برادر کلاں بدر الدین طیب جی کی بڑی بیٹی امیر النسا [۱۸۴۹ء۔ ۱۹۰۸ء] تھیں، اُن کے بطن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:

۱۔علی اکبر [۱۸۶۱۔۱۹۲۳ء] ۲۔علی اصغر [۱۸۶۳۔۱۹۳۷ء] ۳۔زہرا بیگم [۱۸۶۶۔۱۹۴۰ء] ۴۔نازلی بیگم [۱۸۷۴۔۱۹۶۸ء] ۵۔عطیہ بیگم [۱۸۷۷۔۱۹۶۷ء] ۶۔علی اظہر [۱۸۷۹۔۱۹۶۲ء] ۷۔علی اطہر [۱۸۸۳۔۱۹۶۳ء] دوسری زوجہ سے دو بچے مراد اور احمد کمال پیدا ہوئے۔

حسن علی اور ان کی زوجہ امیر النسا(۶) نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں

چھوڑی۔ اپنے عہد کے جدید ترین نظام تعلیم سے ان کو استفادے کا موقع دیا، اور وہ کامیاب و کامران ہوئے۔ چونکہ ہمارا موضوع صرف شبلی کی مکتوب الیہ خواتین ہیں، اس لیے اپنی گفتگو کو وہیں تک محدود رکھنا درست ہوگا۔

عطیہ بیگم فیضی

یکم اگست ۱۸۷۷ء کو آطہ (ترکی) میں پیدا ہوئیں۔[۷] مکتبی تعلیم والد کے زیر نگرانی استنبول میں ہوئی۔ قرآن کریم اور اردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں بمبئی میں واقع اپنے آبائی گھر (مَجگاؤں، ماؤنٹ روڈ) کے متصل زنانہ مشن اسکول (موجودہ میرین ہائی اسکول) میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے داخل کردیا گیا، جہاں گنتی کی مسلمان لڑکیاں داخلہ لیتی تھیں۔ یہاں انھوں نے انگریز اور ہندوستانی اساتذہ سے انگریزی زبان پر دسترس حاصل کی اور ان کے زیر نگرانی آرٹ، مصوری، موسیقی کا اچھا ذوق پیدا کرلیا۔ انھوں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی اور کس آخری سند کا حصول کیا؟ اس کا کہیں مذکور نہیں۔

عطیہ نے خواتین میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اپنی ذہنی قوتوں کا طالب علمی ہی کے دوران استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ ریاست جنجیرہ میں انھوں نے اپنی بہن نازلی کے ساتھ مل کر ان کی قائم کردہ زنانہ اصلاحی تنظیموں کے ذریعے سے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت وفروغ کے لیے کوششیں شروع کردیں۔

۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں جب پہلی لیڈیز کانفرنس ہوئی تو وہ اس میں شریک ہوئیں۔ اسی دوران حکومت نے بنگال میں خواتین کی تعلیم کے لیے لیڈیز ٹرینڈ ٹیچرس ٹریننگ کی ایک اسکالرشپ جاری کی تھی، جس کے تحت دو سال کی ٹریننگ لینے کے لیے حکومت کے مصارف پر انگلینڈ جانا تھا۔ عطیہ اور ایک غیر مسلم بنگالی خاتون سرلا بالا مِتّر کو اس وظیفے کا مستحق قرار دیا گیا اور وہ دیباچۂ 'زمانۂ تحصیل' کے مطابق یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو تنہا لندن چلی گئیں، لیکن وہاں پہنچ کر وہ مستقل علیل رہنے لگیں، لہٰذا تیرہ مہینے وہاں گذار کر بغیر سند لیے وہ ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو بمبئی واپس آگئیں۔[۶] اس تعلیمی سفر کی روداد

انھوں نے تاریخ وار اپنی کتاب 'زمانۂ تحصیل' میں محفوظ کردی ہے، جو تاریخی طور پر مسلم خواتین میں جدید تعلیم کے حصول کے لیے یورپ کے سفر کا نقطۂ آغاز بنی۔

اسی تعلیمی سفر کے دوران یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو اقبال کی خواہش پر مس بیک نے عطیہ اور اقبال کی ملاقات کروائی۔ ہندوستان واپس ہوتے ہوئے عطیہ نے ہالینڈ، جرمنی، (ہائیڈل برگ) میونخ، فرانس (پیرس) کا بھی سفر کیا۔ ۲۲/اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ کیمبرج گئیں اور وہاں اقبال سے دوسری ملاقات ہوئی۔ بعدازاں یہ ملاقاتیں رفاقت میں بدل گئیں اور دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عطیہ نے اپنے نام اقبال کے نو خط شائع کرادیے تھے۔ 'زمانۂ تحصیل' اور 'اقبال لیٹرس ٹو عطیہ' سے اقبال اور عطیہ کی تعلیمی زندگی، ان کی پسند و ناپسند، ان کی رفاقت، ایک دوسرے کے لیے کشش اور اعتماد کی فضا پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، جس پر اقبال شناسوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد عطیہ یہ طے نہیں کرسکیں کہ آئندہ کے لیے ان کے مقاصد زندگی کیا ہیں؟ وہ کس میدان میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گی؟ مولانا شبلی سے پہلی ملاقات (جنوری ۱۹۰۸ء)[۹] کے بعد وہ کچھ پر امید نظر آئیں اور دونوں کے درمیان مراسلت کے دوران یہ مسئلہ زیر گفتگو رہا کہ آیندہ عطیہ کا ہدف کیا ہونا چاہیے۔ شبلی، عطیہ کو لگاتار متوجہ کرتے رہے اور ان میں موجود صلاحیتوں کا انھیں احساس دلاتے رہے، لیکن ان کے خاندانی ماحول اور ریاست جنجیرہ کے نوابی کرّوفر نے انھیں ایک محدود درجے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

۱۹۰۸ء میں انھوں نے نواب جنجیرہ اور اپنی بہن نازلی کے ہمراہ یورپ کا ایک اور سفر کیا، اس سفر میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے استنبول پہنچیں، جہاں سلطان عبدالحمید خاں نے ان کو اور ان کی بہن نازلی بیگم کو نشانِ شفقت عطا کیا، جو طبقۂ نسواں کا ایک تمغہ تھا۔

۵/دسمبر ۱۹۱۲ء کو سموئل رحمین (Samuel Rahamin) نامی ایک یہودالنسل آرٹسٹ سے ان کی شادی ہوگئی، جنھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کا اسلامی نام محمد انور رحامی تھا، لیکن شادی کے بعد انھوں نے سموئل کی جگہ فیضی کا سابقہ لگا کر فیضی رحمین نام اختیار کیا۔ یہی نام

ان کی قبر کے کتبے پر بھی کندہ ہے۔[10]

۱۹۱۳ء میں نازلی بیگم کو اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد جو کثیر رقم حاصل ہوئی، اس سے انھوں نے ۱۹۱۹ء میں مالابار ہل پر 'ایوانِ رفعت' کے نام سے ایک محل نما حویلی تعمیر کرائی۔ اب عطیہ کی دل چسپی کا مرکز یہ حویلی تھی اور یہاں منعقد ہونے والی رنگارنگ محفلیں۔ ماہر القادری نے اپنے مضمون میں بعض ایسی محفلوں کا تذکرہ کیا ہے۔

'عِقدِ ثریا' تنظیم کے علاوہ بمبئی میں انھوں نے 'تھری آرٹ سرکل' کے نام سے ایک اور تنظیم قائم کی تھی، جس کے تحت رقص، موسیقی اور نغمہ کی محفلوں کے علاوہ مختلف قسم کے پروگرام بھی ہوتے تھے۔ شبلی کی وفات ۱۹۱۴ء کے بعد کی عطیہ کی دل چسپیاں مستقل ایک مقالے کی طالب ہیں۔ اس دور کے حالات کے بارے میں حسب ذیل اشارات کر دینا کافی ہوگا۔

۱۹۱۸ء میں وہ امریکہ جاتی ہیں اور وہاں اپنے شوہر کے ساتھ ایک سال گزارتی ہیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں وہ اور ان کے شوہر تین برس تک یورپ کے شہروں میں قیام کرتے ہیں، لندن میں وہ اپنے شوہر کے لکھے ڈرامے اسٹیج کرتی ہیں۔

ہندوستانی موسیقی پر امریکا اور یورپ کے مختلف شہروں میں لیکچر دیتی ہیں۔ مصوری اور دست کاری کی نمائشوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں عورتوں کے حقوق کے لیے آزادانہ اسٹیج پر آ کر آواز بلند کرتی ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ایوانِ رفعت کو فروخت کر کے بمبئی کے ایک ہوٹل میں کرائے پر رہتی ہیں۔ شبلی مخالف سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اوائل ۱۹۴۶ء میں 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتی ہیں، جو ماہنامہ 'ادبی دنیا' لاہور جون ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں محمد علی جناح کی دعوت پر کراچی چلی جاتی ہیں۔[11] حکومتِ پاکستان کی طرف سے انھیں برنس گارڈن کے عقب میں ایک قطعۂ زمین دیا گیا، جس پر انھوں نے ذاتی مصرف سے ایک گھر تعمیر کیا اور تھری آرٹ سرکل کے تحت ادبی اور موسیقی کی محفلوں کا بمبئی کی طرز پر آغاز کیا۔ اسی دوران وہ شبلی پر ایک اور مضمون لکھتی ہیں، جو متعدد جگہ نقل ہوتا ہے۔[12] ۱۹۵۱ء میں

برٹش کونسل کے تعاون سے انھوں نے اقبال ڈے کا اہتمام کیا۔ ۲/اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ان کے شوہر کی وفات ہو جاتی ہے۔ تنگ دستی و ناداری اپنے ہاتھ دراز کرتی ہے۔ جسمانی عوارض بھی غالب آ جاتے ہیں۔ فالج کا حملہ ہوتا ہے اور پانچ دن سیونتھ ڈے ہاسپٹل (کراچی) میں بے ہوش رہ کر ۴/جنوری ۱۹۶۷ء کو وہ جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ قبرستانِ میوہ شاہ کراچی میں ایک احاطہ سلیمانی بوہروں کی تدفین کے لیے مخصوص ہے، عطیہ اسی احاطے میں اپنے شوہر فیضی رحمین کی تربت کے متصل مدفون ہوئیں۔ قبر پختہ ہے اور اس پر کتبہ لگا ہے۔[13]

شبلی کی طرح عطیہ کی شخصیت کی بھی متعدد جہتیں ہیں۔ انھوں نے تین براعظم کا سفر کیا، انٹر نیشنل اسٹیج پر انھوں نے مختلف انداز کے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ اُس دور میں جب عورتیں عام طور پر تعلیم یافتہ نہیں تھیں، وہ کئی زبانوں انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی پر قابلِ ذکر مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم اور ان کی سماجی حقوق کے لیے بڑی کوششیں اور تدابیر کیں۔ زبان، قلم اور قدم سے انھوں نے ہندوستان کے دور دراز حصوں تک جو لوگ عورتوں کے حقوق کے لیے کوشاں تھے ان کا ساتھ دیا۔ اسپیچیں دیں، مضامین لکھے، تجویزیں پیش کیں، لیکن ان تمام کاوشوں میں کوئی ترتیب و تنظیم اور منصوبہ بندی نہیں تھی، اسی لیے وہ کسی بھی محاذ پر اپنی مستقل پہچان نہیں بنا سکیں۔

ادب میں انھیں شبلی اور اقبال کی مکتوب الیہ (اور بعض حلقوں میں منظورِ نظر) کے طور پر جانا جاتا ہے، لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے صحیح کوائف مرتب و شائع نہیں ہو سکے۔

عطیہ کی تین کتابیں بہ زبان انگریزی یادگار ہیں:

i۔ انڈین میوزک (Indian Music)، بار اوّل، لندن، ۱۹۱۴ء

دا میوزک آف انڈیا (The Music of India)، دوم، لندن، ۱۹۲۵ء

سنگیت آف انڈیا (Sangit of India)، سوم بمبئی، ۱۹۴۲ء

دا میوزک آف انڈیا (The Music of India)، چہارم، دہلی، ۱۹۹۵ء

ii۔اقبال لیٹرس ٹو عطیہ بیگم (Iqbal Letters to Attiya Bigum)

(عطیہ بیگم کے نام اقبال کے ۹ خطوط اور چند تصاویر)، اوّل، بمبئی، ۱۹۴۷ء، دوم ۱۹۶۹ء

اس کتاب کا اردو ترجمہ مع اضافہ و توضیحات ضیاء الدین احمد برنی (کراچی ۱۹۵۶ء) ڈاکٹر منظر عباس نقوی (علی گڑھ ۱۹۷۴ء) اور عبدالعزیز خالد (لاہور ۱۹۷۵ء) نے علیحدہ علیحدہ شائع کیا ہے۔

iii۔گارڈنس (Gardens)، طبع اوّل، کراچی، سنہ ندارد، بعد از ۱۹۴۷ء

اردو میں صرف ایک کتاب 'زمانۂ تحصیل' کے نام سے مطبع مفیدِ عام آگرہ سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی، جس کی اساس پر انگریزی کتاب Attiya's Journeys (مطبوعہ دہلی، ۲۰۱۰ء) منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کو لکھنے کا محرک صرف یہ ہے کہ عطیہ ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون ہیں جو سرکاری وظیفے پر ٹریننگ کے لیے لندن گئیں۔ اس دور کے مسلم معاشرے میں یہ جرأت و جسارت ایک انقلابی قدم تھا۔

عطیہ کے انگریزی مضامین کے اردو ترجمے اور چند اردو مضامین، ''تہذیبِ نسواں'' (لاہور)، ''الناظر'' (لکھنؤ)، ''خاتون'' (علی گڑھ)، ''عصمت'' (دہلی)، ''ظل السلطان'' (بھوپال) وغیرہ میں شائع ہوئے۔

عطیہ نے مختلف اوقات میں چار قلمی نام اختیار کیے:

i۔اے۔ایچ۔فیضی (یعنی عطیہ حسن فیضی، مضامین میں)

ii۔فیضی رحمین، عطیہ بیگم (شادی کے بعد، گارڈن)

iii۔عطیہ بیگم رحمین (بعد از شادی، ''زمانۂ تحصیل'' میں)

iv۔فیضی رحمین شاہندہ بیگم (انڈین میوزک)

عطیہ کے حلقۂ احباب میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، اور پارسی سبھی شامل تھے۔ ان میں ہندوستان اور یورپ کے شہزادے، شہزادیاں، نوابین، راجے، مہاراجے، اعلا مرتبت سیاسی قائدین، بین الاقوامی سطح کے تاجر، اور ادیب و دانشور شامل تھے۔

'عطیاز جرنیز' میں انھیں طیب جی خاندان کے دوسرے ممبروں کی طرح گاندھی جی کی تحریک اور ان کے تصوراتِ یورپ کا ہم نوا لکھا گیا ہے۔[۱۴] لیکن حال ہی میں ڈاکٹر نزہت فاطمہ (الہ آباد) نے ''عطیہ فیضی: شخصیت اور کارنامے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔[۱۵] اس میں انھوں نے بعض انگریزی اخبارات خصوصاً The Bombay Chronicle کے ۲۲،۲۱،۱۹۲۰ء کے شماروں کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عطیہ اور نازلی بیگم نے تحریکِ آزادی میں گاندھی جی کے ساتھ دامے، درمے اور قدمے بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے یورپ کی مصنوعات کا بائیکاٹ بھی کیا اور مدتوں کھادی کی ساڑی پہنی۔ گاندھی جی نے اس کا مختلف انگریزی خطوط اور تقریروں میں اعتراف کیا۔ اگر یہ معلومات تحقیق کی رو سے درست ہے تو یہ عطیہ اور نازلی کی حیات کا ایک اور ممتاز پہلو ہے، جو مزید کام کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ علی گڑھ تحریک اور کالج کے سلسلے میں عطیہ کی مخصوص رائے پر بھی یہ خطوط روشنی ڈالنے کا موجب بن سکتے ہیں، جن پر شبلی سے بعض مکاتیب میں اجمالاً گفتگو ہوئی ہے۔

عطیہ بلا کی ذہین اور طباع خاتون تھیں۔ ان کا مذاق بہت بلند تھا۔ ہر چیز کے بارے میں ان کی پسند و ناپسند کا معیار دوسروں سے مختلف ہوتا تھا۔ ایک آرٹسٹک ذہن رکھنے کے سبب مستقل مضطرب رہتی تھیں اور زندگی کے معاملات اور علم و فن کے ہر محاذ سے جلد سے جلد گذر جانے اور اس سے لطف کشید کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ ان خطوط میں بھی ان کی اس حسیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ اردو اہلِ قلم نے عطیہ کو ایک حسن پرست، ذہنی عیاش، پرستارِ شہرت اور اہلِ علم کو اپنی صلاحیتوں سے مرعوب کرنے والی خاتون کی صورت میں دیکھا، اس میں موجود استعداد و صلاحیت، مجلسی تہذیب، حاضر جوابی، علوم و فنون کے متعدد شعبوں سے دل چسپی، خواتین کے جملہ مسائل سے شغف، کچھ کر گزرنے کا جذبہ نہیں دیکھا۔

زہرا بیگم فیضی

۲۹ ستمبر ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئیں۔ اکبر علی خان عرشی زادہ (ف ۱۹۹۷ء) نے سالِ پیدائش

۱۸۶۸ء لکھا ہے[۱۶] لیکن ''عطیاز جرنیز''[۱۷] میں ۱۸۶۶ء ہے، بوجوہ اسی کو اختیار کرلیا گیا ہے۔ مشرقی علوم سے بدرجۂ اتم واقف تھیں۔ غالباً انگریزی زبان سے زیادہ واقف نہ تھیں، لیکن انگریزی تہذیب سے بہ خوبی آشنا تھیں۔ ان کی شادی قمر الدین طیب جی کے بیٹے حیدر سے ہوئی تھی، جن سے بوجوہ طلاق ہوگئی۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ انھوں نے ساری عمر ایک بیوہ کی طرح گزار دی۔ انھوں نے خود کو خواتین کی اصلاح کے لیے وقف کردیا تھا۔ نواب سلطان جہان بیگم سے ان کی دوستی تھی، اور بھوپال اکثر ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔

جس زمانے میں شبلی سے ملاقات ہوئی اس وقت ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ نہایت سنجیدہ اور بردبار خاتون تھیں، فارسی و اردو کا مذاق سخن اچھا تھا۔ ''تہذیبِ نسواں'' (لاہور) کے مدیر سیّد ممتاز علی (ف ۱۹۳۵ء) سے ان کے عزیزانہ مراسم تھے، جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ ان کی وفات پر ''ممتازِ زمانہ'' کے عنوان سے ایک تاثراتی مضمون لکھا تھا۔ (''تہذیبِ نسواں'' جولائی ۱۹۳۵ء) ان کے رسالے ''تہذیبِ نسواں'' کی وہ مستقل قلم کار تھیں۔

ان کی تحریروں کا موضوع عام طور پر عورتوں کی صحت، بچوں کی پرورش و نگہ داشت، تعلیم، شادی، قدیم رسم و رواج، مذہبی غلو، اصلاح معاشرہ، سفرنامے، نئے زمانے کے تقاضوں سے واقفیت وغیرہ رہے ہیں۔ ان کے کچھ مضامین مطبع مفید عام آگرہ نے ۱۹۲۱ء میں شائع کیے تھے۔

مختلف سماجی تنظیموں اور پروگراموں میں بھی وہ عطیہ کے ساتھ موجود رہتی تھیں۔ ۱۹۲۷ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں عطیہ نے پردے سے باہر آکر اسٹیج پر بے باکانہ پہنچ کر جو تقریر کی تھی، زہرا بھی اس میں شریک تھیں۔ عورتوں کے مساوی حقوق اور مساوی مواقع کی عطیہ کی طرح وہ بھی قائل تھیں، اور اس سلسلے کی، ملک میں ہونے والی ہر تحریک اور کوشش کا فراخ دلی کے ساتھ استقبال کرتی تھیں اور ان کے ساتھ تعاون کرتی تھیں۔

شبلی سے ان کی وفات تک عزیزانہ مراسم قائم رہے۔ شبلی جب جب بمبئی جاتے تو وہ ان کی ضیافت کرتیں۔ ان کو اپنے گھر پر کھانے کے لیے مدعو کرتیں، ان کے لیے پرہیز کے کھانے تیار کرتیں۔ ان کا فارسی کا مذاق عطیہ کے مقابلے زیادہ بہتر تھا۔ شبلی ان کو اپنا فارسی کلام بھیجتے اور داد

حاصل کرتے۔

اقبال نے جس سفرنامے کو عطیہ کا مصنّفہ سمجھ کر ان سے ملاقات کا اشتیاق مس بیک سے ظاہر کیا تھا، اس سفرنامے کی مصنفہ یہی زہرا بیگم تھیں، جو ان دنوں ''تہذیبِ نسواں'' میں شائع ہو رہا تھا۔

ان کے ایک مضمون ''تکلیف دہ فیشن کا ایک واقعہ'' (ماہنامہ ''ظل السلطان'' بھوپال، اکتوبر ۱۹۱۳ء) سے پتا چلتا ہے کہ انھیں کوئی مہلک بیماری تھی، جس کے علاج کے لیے انھوں نے ۱۹۱۲ء میں یورپ کا سفر کیا تھا اور انھیں لوزان نامی شہر کے ایک معالج سے فائدہ ہوا تھا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو زہرا نے وفات پائی، بمبئی کے سلیمانی بوہروں کے قبرستان گرگام بمبئی میں مدفون ہوئیں۔ انھوں نے قابلِ ذکر تعداد میں مضامین لکھے، جو ''تہذیبِ نسواں'' (لاہور)، ''الناظر'' (لکھنؤ)، ''خاتون'' (علی گڑھ)، ''عصمت'' (دہلی) وغیرہ میں شائع ہوئے۔

زہرا بڑی رواں اور شستہ اردو لکھتی تھیں، ان کی نثر نگاری پر سرسیّد کی سلیس نثر نویسی کے اثرات محسوس ہوتے ہیں، لیکن زہرا غریب کو اس کی نثر نویسی کی داد، شبلی کے علاوہ آج تک کسی نے نہیں دی۔ سطورِ ذیل میں شبلی کے خطوط سے دو اقتباس نقل کیے جارہے ہیں، جو میرے خیال کی ترجمانی کریں گے:

> آپ کو رہنمائی کی کیا ضرورت ہے؟ آپ اور عطیہ جیسی اردو لکھ لیتی ہیں، کاش ہمارے صوبے بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتی! (خط نمبر۴، بنام زہرا)

> عنایت نامہ عین اس وقت پہنچا، جب میں حیدرآباد سے روانہ ہو رہا تھا اور احباب کا ایک مجمعِ کثیر میرے رخصت کرنے کے لیے جمع تھا، ان میں مسٹر شرر اور مولوی عزیز مرزا صاحب، ہوم سکریٹری بھی تھے۔ آپ کا خط میں نے استعجاباً ان لوگوں کو سنایا اور لوگوں نے آپ کی انشا پردازی کی متحیر ہوکر داد دی۔ (خط نمبر۲۱، بنام زہرا)

اپنے عہد کی خواتین سے متعلق رسائل ان کی دل چسپی کا خاص مرکز تھے۔ امین زبیری نے

''ظل السّلطان'' کا ایک سال مکمل ہوجانے پر ''عرضِ حال'' کے تحت لکھا ہے:

> خصوصیت کے ساتھ زہرا بیگم فیضی صاحبہ نے، جن کا ہر وہ رسالہ یا اخبار جو زنانہ مقاصد کے لیے شائع ہوا یا ہوتا ہے، رہینِ منّت ہے۔ نہ صرف مضامین اور رسالہ کی اشاعت کی کوشش سے امداد کی بلکہ بعض نہایت مفید مشورے بھی دیے اور اس طرح قدمے، درمے، سخنے تینوں قسم کی مدد پہنچائی۔ (''ظل السّلطان''، بھوپال، جون ۱۹۱۴ء، ص:۷۵)

زہرا نے حسبِ ذیل کتب مرتب و شائع کیں، لیکن یہ اب نایاب ہیں:

۱۔ ''مضامین'' (ہندوستان کے مختلف شہروں و صوبوں کے اسفار پر مضامین) مطبع مفیدِ عام آگرہ، ۱۹۲۱ء
۲۔ ''مالِ خاتون'' (ڈراما)، مطبع مفیدِ عام، آگرہ، ۱۹۲۱ء
۳۔ ''تندرستی ہزار نعمت'' (صحت سے متعلق کتابچہ)، مطبوعہ، ۱۹۳۴ء
۴۔ ''یادگارِ امیرا'' (اپنی والدہ امیر النسا، امیّرا کا کلام)، مطبع قدسی، دہلی، ۱۹۳۵ء
۵۔ ''آمین'' (مجموعۂ کلام امیر النسا، امیّرا)، مطبع المطابع دہلی، ۱۹۳۵ء

نازلی رفیعہ سلطان بیگم

کیم مارچ ۱۸۷۲ء (بعض کے نزدیک ۱۸۷۴ء) کو استنبول (ترکی) میں پیدا ہوئیں۔ یہ بھی عطیہ کی طرح کانوینٹ اسکول کی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کے کوائف نہیں ملتے۔ مارچ ۱۸۸۶ء میں ان کی شادی ریاست جنجیرہ[18] کے نواب سر سیدی[19] احمد خاں (۳۱/اگست ۱۸۶۲ء۔۲/مئی ۱۹۲۲ء) سے کردی گئی۔ نواب کی پہلی شادی ۱۰/فروری ۱۸۸۲ء کو نواب احمد بیگم عرف احمد بی بی سے ہوئی تھی، جن کا وصال ۱۸۸۵ء میں ہوگیا۔ اس لحاظ سے یہ دوسری شادی تھی۔ نواب بھی جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے، راج کمار کالج راجکوٹ، پونہ (گجرات) سے فارغ التحصیل تھے، اسی لیے وہ نازلی کی قدر کرتے تھے۔ نازلی نے جنجیرہ میں نواب کو نیا محل بنانے پر اُکسایا، نواب نے انجینئروں کو نقشہ بنانے

اور نازلی کے مشورے سے اس کی تعمیرات کو مکمل کرنے کی ہدایت دی۔ تین سال میں یہ محل تیار ہوگیا اور اسے 'قصرِ احمد' کا نام دیا گیا۔ نازلی نے اس کی آرائش و زیبائش میں اپنی پوری قوت صرف کردی۔

سلطان بیگم، نام کی ایک خاتون نے جو عطیہ اور زہرا کی مشترک شناسا تھیں، اُن کی دعوت پر جنجیرہ کا سفر کیا، اور اپنی یادوں کو ایک مضمون کی صورت میں محفوظ کردیا۔ یہ سفرنامہ ''سیر جزیرۂ حبشان'' کے عنوان سے ماہنامہ ''خاتون'' علی گڑھ کی اگست ۱۹۱۰ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ اسی سفرنامے میں لکھا ہے کہ:

> قصرِ احمد کو بنے ہوئے ابھی تین سال ہوئے ہیں۔ اس محل کا نقشہ خود بیگم صاحب نے بنایا ہے۔ بعض ایشیائی وضع کی تعمیر جو انگریز انجینئر کی سمجھ میں نہ آسکتی تھی، اس کو بنوانے اور سمجھانے میں بھی خود ہی شریک رہیں۔

اسی سفرنامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عورتوں کی ایک انجمن ''بزمِ اتحاد'' کے نام سے بنائی تھی، جس کی اپنی عمارت تھی، جس کی خواتین ممبر تھیں جو ہر جمعے کو پابندی کے ساتھ جمع ہوتی تھیں۔ بزمِ اتحاد کی دو سکریٹری تھیں۔ ایک ہندو عورتوں کی طرف سے اور ایک مسلمان عورتوں کی طرف سے۔ دونوں اپنے اپنے پروگرام کو اردو اور مراٹھی میں ترتیب دیتی تھیں۔ یہ اتحاد مذہب اور زبان دونوں کا تھا۔

جنجیرہ میں آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس اعتبار سے بزمِ اتحاد کی اہمیت کو محسوس کیا جانا چاہیے۔

انھوں نے ریاست میں خواتین کی تعلیم، ان کی دست کاری، ان کی ذہن سازی کے لیے مختلف قسم کی تنظیمیں بنائیں اور ان کے تحت رفاہی کام انجام دیے۔ ان کی دونوں بہنیں ان کو بھرپور تعاون دیتی تھیں۔ انھوں نے ریاست کی جانب سے قائم زنانہ مدارس میں بھی دل چسپی لے کر ان کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی۔ ہندوستان کی نامور شخصیات جو عطیہ کی شناسا، یا ان کے حلقۂ احباب میں سے تھیں، اکثر یہاں مدعو کی جاتی تھیں۔ باوجود اس کے کہ ریاست کی زبان و ماحول اردو سے بہت زیادہ آشنا نہیں تھا، لیکن نازلی اور عطیہ کی کوشش سے یہ ریاست بھی اردو کو اپنے

یہاں زندہ رکھنے اور مشرقی آداب و تہذیب کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھی۔

نازلی نے ۱۸/ستمبر ۱۹۶۸ء کو وفات پائی،[۲۰] قبرستانِ میوہ شاہ کراچی میں عطیہ کی قبر کے جانبِ چپ مدفون ہوئیں۔ قبر پختہ ہے اور اس پر کتبہ لگا ہوا ہے۔

نازلی نہایت سنجیدہ اور خاموش طبع خاتون تھیں۔ خواتین سے متعلق پروگراموں میں وہ مدعو کی جاتی تھیں اور وہی صدارت کرتیں، انجمن خواتین اسلام یعنی ''آل انڈیا لیڈیز ایسوسی ایشن'' علی گڑھ (قیام ۱۹۱۴ء) کی بھی انھوں نے سرپرستی کی۔ ''بھارت استری منڈل'' الٰہ آباد کے ایک اجلاس [جو نمائش کے موقع پر دسمبر ۱۹۱۰ء میں منعقد ہوا تھا] کی صدارت کی تھی۔ (''خاتون''، علی گڑھ، مئی ۱۹۱۱ء)

وہ بیگم جنجیرہ ہونے کے سبب دربار داری کے آداب سے واقف تھیں۔ یہی وجہ ہے جب ۱۹۰۵ء میں شاہزادہ ولی عہد بہادر کے ہمراہ شاہزادی ویلز کی آمد پر بمبئی میں ولی عہد بیگم کے خیر مقدم میں ایک جلسہ آراستہ کیا گیا، جس میں شہر بمبئی کی ممتاز خواتین نے حصہ لیا، تو اس محفل میں نازلی بیگم نے شاہزادی ویلز اور خواتین کے درمیان تعارف میں ترجمانی کا کام انجام دیا۔ وہ بہ یک وقت اردو اور انگریزی روانی کے ساتھ بول لیتی تھیں۔ لیڈی جہانگیر نے ایگزیکیوٹو کمیٹی کی جانب سے انگریزی ایڈریس پیش کیا، اس کے بعد نازلی بیگم نے اردو ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ مس عطیہ ایچ فیضی [عطیہ فیضی] نے دوسری بیگمات کے ساتھ مل کر اس محفل میں حافظ شیرازی کی غزل ساز کے ساتھ گائی۔ اس جلسہ کی روداد زہرا فیضی نے ''خیر مقدم شاہزادی ویلز'' کے نام سے لکھی، جو ''خاتون'' علی گڑھ (نومبر ۱۹۰۵ء) میں شائع ہوئی۔ انھوں نے یہ روداد، زہرا خانم کے نام سے لکھی تھی۔

نازلی کے دن مسرت و شادمانی سے گزر رہے تھے، لیکن اولاد نہ ہونے کے سبب ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑنے لگی تھی۔ ریاست کے سربراہ کو ایک جانشین چاہیے تھا، جس کے آثار مفقود ہو چکے تھے۔ غالباً اولاد کے حصول کے لیے تیسری شادی کا منصوبہ نازلی گوارا نہ کر سکیں۔ نواب نے ۲۷/فروری ۱۹۱۳ء کو تیسری شادی کلثوم بیگم (۱۸۹۷۔۱۹۵۹ء) سے کر لی، جن کے بطن سے ۷/مارچ ۱۹۱۴ء کو ایک بیٹا پیدا ہوا، جو سیدی محمد خاں (ف، یکم اپریل ۱۹۷۲ء) کے نام سے نواب کا جانشین بنا۔ یہی شادی نازلی اور نواب کے بیچ وجہ نزاع بنی اور ستمبر ۱۹۱۳ء میں دونوں کے بیچ طلاق واقع ہوگئی۔[۲۱]

طلاق کے ساتھ انھیں کثیر رقم دی گئی، جس سے انھوں نے ۱۹۱۹ء میں مالابار ہل پر ''ایوانِ رفعت'' تعمیر کرایا، جو نازلی، عطیہ اور ان کے شوہر کی باقی ماندہ زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔[۲۲]

طلاق کے ساتھ دونوں کے بیچ معاہدہ ہوا کہ نواب جنجیرہ مطلقہ کو ۳۰۰۰ ہزار روپے ہر ماہ ادا کریں گے اور مطلقہ اپنے نام کے ساتھ 'بیگم صاحبہ' کا سرکاری لاحقہ اور گارڈ آف آنر کی مجاز رہیں گی، لیکن رفتہ رفتہ تلخیاں بڑھتی گئیں اور نوبت مقدمہ داری تک جا پہنچی۔ نواب کی وفات (۱۹۲۲ء) کے بعد اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ یہ مقدمہ ۱۹۱۴ء کو جنجیرہ میں دائر کیا گیا تھا اور یہ وائسرائے کے یہاں تک جا پہنچا۔ اقبال نے ۱۷/اپریل ۱۹۳۳ء کو وائسرائے کے سیکریٹری کو خط لکھ کر اس مقدمہ کو صحیح خطوط پر سمجھنے اور مناسب فیصلہ دینے کی سفارش کی تھی، لیکن یہ سفارش غالباً ناکام ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اپنی کتاب ''اقبال اور بمبئی'' میں اقبال کے خط کا مکمل عکس اور ترجمہ دیا ہے۔[۲۳] جس سے مقدمہ کے بارے میں خاصی معلومات مل جاتی ہیں، لیکن دلوی صاحب نے شبلی اور جنجیرہ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اس کی کہیں کوئی سند نہیں ملتی، بعض تاریخیں بھی انھوں نے غلط درج کی ہیں۔

نازلی کا قلم و قرطاس سے بھی تعلق تھا۔ بیگم جنجیرہ بننے کے بعد وہ مستقل روزنامچہ لکھا کرتی تھیں۔ اس سلسلے کو انھوں نے ''اخبار نامہ احمد گنج مُرد جزیرہ'' نام دیا تھا۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ اب کہاں ہے۔

ان کی مصنَّفہ دو کتابوں کا پتا چلتا ہے:

سیرِ یورپ: نازلی نے اپریل ۱۹۰۸ء میں اپنے شوہر، سر سیدی احمد خاں، بھائی علی اصغر فیضی، بہن عطیہ بیگم فیضی، سردار سید حسن، سیدی سعید، ڈاکٹر ہاشم لکھائی، ایک ملازم اور خادمہ کے ساتھ یورپ کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کی روداد نازلی، خطوط میں لکھ کر اپنے اعزا کو بھیجتی رہیں، اور اپنے پاس بھی روزنامچہ کی صورت میں محفوظ رکھا۔ بعد میں انھی خطوط اور روزنامچے کو زہرا بیگم فیضی نے مرتب کر دیا

اور یہ پہلی مرتبہ یونین اسٹیم پریس لاہور سے چھپ کر مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا۔ اس پر سالِ اشاعت درج نہیں۔ عام طور پر اسے ۱۹۰۸ء کا مطبوعہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن اگست ۱۹۱۰ء کے ''ادیب'' الٰہ آباد میں بیگم صاحب کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے: ''بعض احباب کی درخواست پر جناب عالیہ اپنے سفرنامۂ یورپ کو کتابی حیثیت میں بہ زبان اردو شائع کرنے والی ہیں'' سے یہ باور ہوجاتا ہے کہ یہ اگست ۱۹۱۰ء تک شائع نہیں ہوا تھا۔ راقم الحروف نے ماہنامہ ''عصمت'' دہلی کے مارچ واپریل ۱۹۱۱ء کے شماروں میں اس کی قسطیں دیکھی ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے ''عصمت'' میں بالاقساط شائع ہوا بعدازاں کتابی شکل میں طبع ہوا۔

نازلی نے اس کا انتساب اپنی والدہ ماجدہ امیر النسا بیگم کے نام کیا ہے۔ سفرناموں کی جو فہرستیں شائع ہوئی ہیں، ان میں اس سفرنامے کا مذکور نہیں۔

سرگذشت: خطوطِ شبلی کے آخر میں ظل السلطان بک ایجنسی کے اشتہارِ کتب میں بیگم جنجیرہ کی مطبوعات ''سیرِ یورپ'' کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ کتاب کے نام سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ نازلی کی آپ بیتی ہوگی، اور یہ ۱۹۲۶ء سے پیش تر ہی شائع ہوئی ہوگی۔ باوجود کوشش کے راقم الحروف اس کو دیکھنے سے قاصر رہا۔ ماہنامہ ''عصمت'' دہلی کے ۱۹۱۷ء کے فائل میں اس کا اشتہار نظر سے گزرا ہے، اس سے ۱۹۱۷ء یا اس سے کچھ پیش تر اس کی اشاعت قیاس کی جاسکتی ہے۔

ادب وکلچر اور سماجی کاموں سے ان تینوں بہنوں کی یکساں دل چسپی اور شغف دیکھ کر یورپ کی وہ تین بہنیں یاد آجاتی ہیں، جو Bronte sister کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ یہ تینوں بہ یک وقت فکشن اور شاعری سے شغف رکھتی تھیں، اور تینوں کی آپسی محبت اور اتحاد مثالی تھا، لیکن زہرا، نازلی اور عطیہ کے مقابلے میں ان کی عمریں بہت مختصر ہوئیں۔ (۲۴)

مذکورہ بالا حالات پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ خطوطِ شبلی کا قاری، شبلی کی مکتوب الیہ ان خواتین کی علمی وادبی حیثیت کا اندازہ لگا سکے، اور ان کے ذوق ودل چسپی کے میدان سے واقف ہوکر ان خطوط سے استفادے کی صحیح راہ ہموار کرسکے۔

—۲—

مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی کے درمیان مراسم وتعلق کس طور استوار ہوا، اور اس کے اثرات و نتائج ان کی شخصی شہرت اور علمی منزلت پر کیا مرتب ہوئے، اس کو جانے بغیر خطوطِ شبلی سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا شبلی سفرِ روم ومصروشام کے دوران جب قسطنطنیہ پہنچے، تو اچانک سرِ راہ ان کو ایک شخص نے روک کر استفسار کیا کہ ''آپ ہندوستانی تو نہیں''؟ شبلی نے کہا، 'نعم' (یعنی ہاں) وہ شخص گلے سے لپٹ گیا اور بولا: ''آپ تو ہماری چیز ہیں، ہم سے بچ کر کہاں چلے تھے''! اس کے بعد وہ شخص شبلی کو اپنے مکان پر لے گیا اور ان کی بھرپور ضیافت کی، شبلی جب تک وہاں رہے وہ ان کی خبر گیری کرتا رہا۔ یہ شخص کوئی اور نہیں عطیہ کے والد حسن علی آفندی تھے۔ شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے:

> ہندوستانی اشیا کی تجارت کرتے ہیں... تمام لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ سلطان کے یہاں سے مُڈل [میڈل] بھی ملا ہے۔ انگریزی بہ خوبی جانتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق، فیاض، روشن ضمیر، نیک طبع آدمی ہیں۔ ہندوستانیوں سے ان کو عجیب لطف ومحبت ہے... معلوم نہیں مہمان نوازی ان کی طینت کا خمیر ہے یا قسطنطنیہ کی آب وہوا کا خاصہ ہے... میں نے ان کا پتا اس غرض سے لکھا ہے کہ کوئی صاحب قسطنطنیہ کا قصد کریں تو ان سے ضرور ملیں، ان سے بڑھ کر کوئی غم خوار نہیں مل سکتا ہے۔ (۲۵)

شبلی، حسن علی سے پہلے سے واقف نہیں تھے، ہاں گمان بدرجہ یقین ہے کہ وہ بدرالدین طیب جی سے واقف رہے ہوں گے۔ ۱۹۰۳ء میں وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بمبئی گئے اور وہاں طیب جی کے زیرِ صدارت اجلاس میں شرکت کی، ان کی نشست ڈائس پر تھی۔ اس دوران طیب جی سے ملاقات کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حسن علی کی وفات اسی سال ۱۹۰۳ء میں ہوگئی۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۳ء کے دوران دونوں کے درمیان خط کتابت ضرور ہوئی ہوگی، لیکن اس کے

شواہد دستیاب نہیں۔

عطیہ کے مضمون 'مولانا شبلی اور خاندان فیضی' کی تمہید سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شبلی کے مدّاح تھے، اور اکثر اپنی بیٹیوں سے ان کا تذکرہ زبانی اور خطوط میں کیا کرتے تھے۔

شبلی نے حادثۂ پا ۱۷/مئی ۱۹۰۷ء کے بعد مصنوعی پاؤں بنوانے کے لیے اوائل دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی کا سفر کیا۔ ۶/دسمبر ۱۹۰۷ء تا ۱۰/فروری ۱۹۰۸ء وہ بمبئی میں رہے۔[۲۶] اسی دوران ان کی پہلی ملاقات عطیہ و زہرا سے ہوئی۔ عطیہ لکھتی ہیں:

> ۱۹۰۹ء [صحیح: ۱۹۰۸ء] کی بات ہے، جب مولانا اپنے پیر کے علاج کے لیے بمبئی تشریف لائے، بائیکلہ میں ٹھہرے تھے۔ ہمشیرہ [زہرا] کے نام ایک خط لکھا اور اس میں ظاہر کیا کہ: ''میں آپ دونوں بہنوں سے ملنا چاہتا ہوں''۔ ہم مولانا کے ہاں بڑے شوق سے گئے، کیوں کہ والد نے اپنے خطوں میں ان کی قابلیت کا بہت کچھ ذکر کیا تھا اور ہمیں بھی ان سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا پردے کے پابند تھے اور پرانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ ہمارے [لیے] برآمدے میں دو چوکیاں رکھوا دی تھیں اور آپ دروازے کی آڑ میں بیٹھے۔ میں نے کہا: ''مولانا معاف فرمایئے، منھ تو گنہ گار چھپاتے ہیں، خدانخواستہ گنہ گار نہ تو آپ ہیں نہ ہم؛ اگر آپ باہر تشریف نہیں لا سکتے تو خدا حافظ!'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی سی دیر کے بعد مولانا آہستہ آہستہ باہر آئے، ان کے پیر میں بندوق کی گولی کی چوٹ لگی تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر رک رک کر چلتے تھے۔[۲۷]

اس پہلی ملاقات میں شبلی نے پردے کا ذکر چھیڑا اور تلقین کی کہ عورت کو پردے میں رہنا چاہیے۔ عطیہ اس پر کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ زہرا نے انھیں روک دیا۔ اس کے بعد مولانا نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اس موقع پر مولانا نے ایک کتاب اور کاغذ عطیہ کو دیا، جس پر ان کے غیر مطبوعہ اشعار لکھے تھے۔[۲۸]

شبلی نے اس سفر بمبئی اور خاندان فیضی کی خواتین سے ملاقات کا تذکرہ احباب سے کچھ اس

طرح سے کیا:

> اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں...آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ (بنام شروانی، مکتوبہ ۲۶/فروری ۱۹۰۸ء)

> بمبئی میں بڑی دل چسپیاں رہیں، جو موزوں ہوکر قلم سے نکلیں۔ (بنام مہدی افادی، مکتوبہ ۲/مارچ ۱۹۰۸ء)

> بمبئی میں تعلیم نسواں کے عجیب حیرت انگیز نمونے دیکھے۔ جنس لطیف کے پبلک لکچر اور اسپیچیں سنیں اور پرائیویٹ صحبتوں میں ان کی قابلیت دیکھی، تعجب ہوا، لیکن چنداں خوشی نہیں۔ (بنام شروانی، ۵/مارچ ۱۹۰۸ء)

> زنانہ جلسہ بہت کامیابی کے ساتھ ہوا۔ گجراتی اور مرہٹی میں عورتیں خوب بولیں، بعض عورتیں تو مرد معلوم ہوتی تھیں۔ (بنام عبدالقادر، ۱۰/فروری ۱۹۰۸ء)

عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی سے شبلی کی پہلی ملاقات کی بابت صرف اسی قدر معلومات حاصل ہوسکی۔ اِدھر عطیہ اور زہرا ملاقات کر کے واپس گئیں اُدھر نواب جنجیرہ نے غالباً انھی کی تحریک پر شبلی کو جنجیرہ آنے کی دعوت دے دی (خط بنام عبدالقادر، ۱۰/فروری ۱۹۰۸ء)

اس کے بعد مراسلت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ ایک مرتبہ شبلی جنجیرہ گئے (۷/اکتوبر ۱۹۰۹ء تا ۱۶/اکتوبر ۱۹۰۹ء) اور دو مرتبہ عطیہ لکھنؤ آئیں۔

سفر جنجیرہ سے متعلق عطیہ کے مضمون اور ڈائری کے ایک اندراج سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی وہاں انتہائی مسرور رہے اور اپنے میزبانوں کے سلوک سے متاثر اور شادماں ہوئے۔ عطیہ لکھتی ہیں:

> کچھ عرصہ کے بعد ہم نے مولانا کو جزیرہ آنے کی دعوت دی، جسے انھوں نے

> قبول کیا اور جزیرہ میں کافی عرصہ تک ہمارے مہمان رہے۔ ہمارے مکان میں عورتوں کی حکومت تھی اور مولانا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کل اہتمام ہماری زیرِ نگرانی عورتیں کرتی تھیں۔ عورتوں کے لیے دار العلوم وفنون، کلب وغیرہ سبھی کچھ موجود تھے۔ اس وقت نواب ممتاز الدولہ(۲۹) مشیر حسین قدوائی،(۳۰) سروجنی نائیڈو(۳۱) بھی محل پر ہماری مہمان تھیں۔ وہ ہمارے اس انتظام کو دیکھ کر کہنے لگے کہ: اس قسم کی تعلیم و تربیت سے قوم کی حالت بدل سکتی ہے؛‘‘ مگر مولانا خاموش تھے۔ چونکہ عالم سمجھ دار تھے، رفتہ رفتہ مسرت اور تعریف کا اظہار اشعار میں ہر موقع پر کرنے لگے۔ یہ اشعار موجود ہیں اور تصویریں بھی، جو ہر خوب صورت مقام پر میں نے کھینچی تھیں۔ بہرحال مولانا شبلی جزیرہ میں بے حد خوش تھے۔ جب انھوں نے ’المخزن‘ یعنی ہماری لائبریری کو دیکھا اور اس کے انتظام اور ترتیب کو، تو فرمانے لگے کہ: اپنی تمام کتابیں میں اس لائبریری کی نذر کرتا ہوں‘‘ ... میں نے کہا... اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ وہیں ایک صیغہ عورتوں کی تعلیم کا کھول دیجیے۔
> (شبلی معاصرین کی نظر میں: ۱۸۰)

عطیہ کی ڈائری میں اس کا مختصر اندراج یہ ہے:

> آخر مولانا شبلی صاحب اور مشیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے مدتوں سے وعدہ تھا مگر بارے شکر کہ اجرا ہوا۔ اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی چند اشعار اس جگہ کے متعلق کہے، ان کی شاعرانہ طبیعت جوش میں آ گئی اور یہ غزل دو گھنٹے کے عرصہ میں لکھ کر بھیج دی: کسی کو ہاں...(۳۲)

عطیہ پہلی مرتبہ غالباً مشیر حسین قدوائی (تعلقہ دار گدیہ ضلع بارہ بنکی) کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لائیں، اور انھی کی مہمان بھی رہیں، لیکن ان کے لکھنؤ آنے اور یہاں قیام کرنے کی مدت کا پتہ نہیں چلتا۔

شبلی کے ایک خط سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ عطیہ لکھنؤ میں ہیں اس سے زائد کچھ نہیں۔ مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

> لکھنؤ کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ، یعنی اس کا پہلا جز [مہ] کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت، نہ دماغ؛ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ۔ زباندانی، مصوری، نقشہ کشی، پالیٹکس، قوت تحریر... آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری(۳۳) افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی، ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔ (خط مکتوبہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء)

گویا نومبر ۱۹۰۸ء کے آخری عشرے میں وہ اور ان کی بہن زہرا فیضی لکھنؤ میں موجود تھیں۔ اسی ماہ میں شبلی ندوہ کے سنگ بنیاد اور سالانہ جلسے کے انعقاد کے سلسلے میں مصروف کار تھے۔

دوسری مرتبہ انھوں نے کب لکھنؤ کا سفر کیا، اس کے اشارے نہیں ملتے، البتہ ان کے مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شبلی ہی کے یہاں ٹھہری تھیں۔ اس سفر کی بابت انھوں نے اپنے ایک انگریزی مضمون (مطبوعہ Mirror, Karachi جس کا ترجمہ رئیس احمد جعفری نے ’عطیہ بیگم فیضی اور خاندانِ فیضی‘ کے نام سے کیا ہے) میں لکھا ہے:

> بھوپال سے ہم لکھنؤ پہنچے۔ مولوی شبلی جنھوں نے ہمیں دعوت دی تھی، جب ہماری ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی، ہم نے انھیں دور ہی سے کونے میں کھڑا دیکھا، جو، اب واپس جا رہے تھے۔ ان کا ایک ملازم چھوکرا ہمیں گاڑی تک لے گیا۔ آگے آگے شبلی کی گاڑی [بگھی] پیچھے پیچھے ہماری۔
> شبلی نے اپنے ایک عزیز کی پرانی قسم کی حویلی میں ہمیں ٹھہرانے کا

انتظام کیا تھا۔ وہ چھوکرا ہمیں تنگ و تاریک سیڑھیاں اور کمرے طے کراتا حویلی کی دوسری منزل پر لے گیا، جہاں ہم نے کئی خواتین کو زرق برق نور جہانی لباس میں ملبوس دیکھا۔ یہ سترھویں صدی کی ہاتھی دانت کی پینٹنگ معلوم ہو رہی تھیں۔ ان میں زندگی اور حرکت نہیں تھی یہ بڑی دل آویز اور خوب صورت عورتیں تھیں، لیکن ان کی ہر چیز پر قدامت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خاندانی وقار اور پردہ ان کی جان کے ساتھ تھا۔[۳۴] ...شبلی نے مجھے لکھنؤ بلوا کر ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ انھوں نے تمام علما و فضلا کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی [کہ] عورت مرد کے ماتحت ہے، اس لیے ایثار و قربانی، ترک اور تیاگ کی زندگی بسر کرے۔ ہم پہلے سے ایک کمرے میں بٹھائے گئے تھے، جب یہ باتیں سنتے سنتے میں عاجز آ گئی تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا، میں نے سوچا کہ اس صورت حال کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے کہا... جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے، یہ قرآن کہتا ہے؛ اور دوزخ باپ کے پاؤں کے نیچے ہے، یہ شیطان کہتا ہے... اور یہ دونوں بڑی سچائیاں ہیں۔ میرے یہ الفاظ بم کا گولہ ثابت ہوئے۔[۳۵]

عطیہ کا یہ دوسرا سفر کب واقع ہوا، وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس سفر کے بیان کے معاً بعد شبلی کے سفر جنجیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عطیہ کا یہ سفر شبلی کے سفر جنجیرہ اکتوبر ۱۹۰۹ء سے پیش تر کا رہا ہوگا۔ ۱۵؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انھوں نے بمقام جنجیرہ پانچ اشعار پر مشتمل جو غزل کہی تھی، اس کا آخری مصرع: ''عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی''، عطیہ کے اِسی سفر لکھنؤ کی یاد کو تازہ کرتا ہے اور اس احساس کا ترجمان ہے کہ لکھنؤ کے سفر میں یاد رکھنے کے قابل تھا ہی کیا؟

دسمبر ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد میں سالانہ نمائش منعقد ہوئی۔ شبلی کی دعوت پر عطیہ اس نمائش میں

شریک ہوئیں۔ عطیہ کی ڈائری کے ایک اندراج سے پتہ چلتا ہے کہ اس دوران شبلی بھی الٰہ آباد پہنچ گئے اور عطیہ کی ضیافت کی۔ عطیہ لکھتی ہیں:

نمائش الٰہ آباد، دسمبر ۱۹۱۰ء

ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقات کے لیے آتے تھے اور بلا ناغہ ایک خوان عمدہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بے چارے 'بڑھے میاں' گو کہ پرانی وضع کے ہیں، مگر خیالوں کی وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرا سی یہ بات ہوتی۔ (شبلی نامہ: ۱۵۷، ۱۵۸)

دسمبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد ۱۹۱۳ء میں شبلی کی ملاقات عطیہ اور ان کے شوہر فیضی رحمین سے ہوئی۔ شبلی نے فی البدیہہ دو قطعے کہے۔ یہ قطعے عطیہ کی ڈائری کے ایک اندراج سے محفوظ ہو گئے۔ عطیہ لکھتی ہیں:

۳؍جون ۱۹۱۳ء: اس شام کو تمام شام، مولانا شبلی نے ہمارے ہاں گزاری۔ انھوں نے ایک رباعی [کذا] میرے لیے کہی اور ایک رحمین کے لیے:

عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی
کہا میں نے کہ جاہل ہے، یا احمق ہے، یا ناداں ہے
بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اِک کافر مسلماں ہے

شبلی از زبانِ سموئل (رحمین):

ایک مدت سے مجھے شوق ہے تصویروں کا
اس سے بڑھ کر کوئی تفریح کی تدبیر نہ تھی
تھی عطیہ کی بھی خواہش کہ مرقع میں مرے
اور سب کچھ تھا، فقط حسن کی تصویر نہ تھی

(شبلی نامہ: ۱۵۸)

عطیہ کی ڈائری کا آخری اندراج بہت اہم ہے، جو انھوں نے حالی اور شبلی کی وفات کے کچھ دنوں بعد ہی لکھا تھا، اس میں انھوں نے شبلی کو اپنا دوست لکھا ہے:

> یہ کیسے مشاہیرِ ہند چلے گئے اور مولانا (شبلی) صاحب تو کیسے ''ہمارے دوست'' تھے اور ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ:
>
> یادگارِ زمانہ ہیں ہم
> سن رکھو فسانہ ہیں ہم[۳۶]
>
> (شبلی نامہ: ۲۵۹)

شبلی نے بھی متعدد خطوط میں عطیہ کو اپنا ''دوست'' لکھا ہے، عطیہ کو لکھتے ہیں:

> کسی عزیز اور ''دوست'' کی رخصت کے وقت کا میں تحمل نہیں کر سکتا۔
>
> (خط مکتوبہ ۲۳/مارچ ۱۹۰۸ء)

ایک دوسرے خط میں پھر عطیہ کو لکھتے ہیں:

> سرسیّد احمد، حالی اور تمھارے حقیر ''دوست'' کی تصنیفات ناقدری کے قابل نہیں۔ (۲۶/مئی ۱۹۰۹ء)

مہدی افادی کے نام ایک خط میں عطیہ کے سیاسی خیالات کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ انھیں ''دوست'' لکھا ہے:

> مکرمی! آپ میرے جس ''دوست'' کے پولیٹیکل خیالات کے قدر دان ہیں اور جس کا جواب آپ نے ٹرکی کے موجودہ انقلاب میں دیا تھا، اس کے ایک خط کے یہ الفاظ ہیں... عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے، اس کی اور ینگ ٹرکی کی نسبت ''میرے دوست'' کی رائے صحیح ہے، تو کم وقعت فرقۂ جدیدۂ ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابلِ وقعت ہوگی۔ میں تو بخدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں۔
>
> (بنام مہدی، ۳/جون ۱۹۰۹ء)

سطورِ گزشتہ میں عطیہ کی تحریروں کے جو طویل اقتباسات دیے گئے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ عطیہ اور شبلی کی دوستی، باہم علمی اور دانش ورانہ گفتگو و خط کتابت کو ان کے بیچ دوستانہ اور عزیزانہ ماحول کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے، ان کو اِس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے، نہ کسی دوسرے شخص کے پیش کردہ خیالات پر ان کی بنیاد رکھی جائے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے نام عطیہ کے دو دستیاب خط بھی نقل کر دیے جائیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے جہاں عطیہ کے دل میں شبلی کی عزت و احترام کا جذبہ محسوس ہوتا ہے، وہیں عطیہ کی اردو مکتوب نویسی کے انداز پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ دو خط 'عطیہ کے خطوط موسومہ شبلی نعمانی'' عنوان سے ''آجکل'' دہلی، ستمبر ۱۹۶۳ء میں فیض الرحمٰن اعظمی (۱۹۲۸ء۔۱۹۷۲ء) نے مناسب تمہید کے ساتھ شائع کرا دیے تھے۔ خط حسبِ ذیل ہیں:

> اللہ اکبر!
>
> مکرم و محترم، جناب مولانا دام مجدکم
>
> تسلیمات۔ عرض خدمت ہے، آپ کے دو مشرف نامے اور کتابیں برابر مل گئیں۔ حضور عالی اور بہن جان کل تشریف لائے بمبئی، اور اسی وقت بہن جان کا مال ان کو دے دیا۔[۳۷] اس قدر خوش ہوئیں کہ کیا عرض کروں۔ کہنے لگیں کہ دنیا میں کوئی چیز اس سے بڑھ کر مقبول نہیں ہوسکتی تھی۔ بہت ادب کے ساتھ آپ کا بہت بہت احسان مانتی ہیں۔ آگرے کی نسبت ضرور اطلاع دوں گی۔ ندوہ کے کُل کاغذات جو آپ نے عنایت فرمائے تھے، وہ ہمشیرہ جان[۳۸] نے دیے اور میں نے پڑھے۔ یہاں کون اس قابلیت کا ہے جو وہاں جائے اور شریک ہو؟ حضور نواب صاحب اور بہن جان علی ہذا القیاس سارے حبشان کو غم ہے کہ آپ جزیرہ تشریف نہ لے جاسکے۔ ان لوگوں کی بدقسمتی۔ کاش یورپ ہمارے ساتھ آپ چل سکتے! یہ بھی ہماری قسمت بلکہ کُل ہندوستان کی! خدا کرے پاؤں کے بننے سے آپ کو کسی قدر آرام ہو۔

آپ کو چند باتیں مجھے لکھنی ہیں، بندی حاضر ہے۔ زیادہ حدِ ادب! اماں جان، حضور نواب صاحب، ہمشیرہ جان زہرا بہن، نازلی بیگم، سب آداب کہتے ہیں۔

عاجزہ، عطیہ

از ماؤنٹ ٹاورز، مزگاؤں،(۳۹) بمبئی — ۱۲؍فروری ۱۹۰۸ء

دوسرے خط پر سنہ مرقوم نہیں۔ ۱۳؍جنوری ۱۹۱۰ء کے خط نمبر ۴۴ کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ خط میں بڑے لمبے سفر سے واپسی کا مذکور ہے، اس سے مراد سفر یورپ ہی ہوسکتا ہے، بہرحال خط حسب ذیل ہے:

Ahmad Gunj

Murud Janjiri

محترم جناب مولانا شبلی صاحب!

زمانہ ہوگیا کہ آپ کی طرف سے کوئی خبر نہیں ہے۔ آپ کے دو مشرف نامے مجھے کپورتھلہ اور دہلی میں ملے تھے، ان کے جواب میں نہیں لکھ سکی؛ کیوں کہ میرا ارادہ نہ ہوا۔ بڑا لمبا سفر کرکے آخر تھوڑا عرصہ ہوا کہ اس بہشت [جنجیرہ] میں آئی اور اب اس کو دیکھ کر سارے اول کے ارادے منقطع کرنے ہوتے ہیں اور کہیں جانے کا دل نہیں ہوتا۔ ورنہ [اس] ہفتے میں، میں منصوری جانے والی تھی، مگر اب تو شاید سال بھر یہاں سے قدم نہ اٹھاؤں۔ دنیا میں سب سے اچھا مقام یہی ہے۔ ہمشیرہ جان سے سنا کہ ''شعرالعجم'' حضور کے پاس آچکا ہے، میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ آجکل سروجنی نائیڈو بھی یہاں ہیں، اس سے لطف دوچند رہتا ہے۔ بڑی خوش اور رنگین طبیعت ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا بمبئی میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انگریزی میں عمر خیام با تصویر نکلی ہے، آپ نے اس نسخے کو دیکھا ہے؟ ضرور دیکھیے اور کسی انگریزی داں سے کہیے کہ آپ کو ترجمہ کرکے سنائیں۔ تین چار نسخے نکلے ہیں، لیکن سب سے اچھا Edmund Dulac کا ہے۔ اس مصور کو بذات خود میں اچھی طرح جانتی ہوں اور خیالوں سے میں [نے] مدد بھی کی ہے، بلکہ چند تصویریں تو

تقریباً میرے خیالوں کا نتیجہ ہے [ہیں]۔ کاش میں مصور ہوتی! امید ہے کہ آپ کا مزاج بہت اچھی طرح سے ہے۔

عاجزہ، عطیہ

۳۰؍مارچ [۱۹۱۰ء]

مذکورہ بالا دونوں خط خواتینِ فیضی کی اردو نویسی کا نمونہ ہیں۔ شبلی اس اردو نویسی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دوست عبدالقادر کو لکھتے ہیں:

اس اثنا میں زہرا اور عطیہ فیضی کے بہت سے خطوط آئے اور بعض میں علمی مضامین بھی تھے۔ ان ظالموں کی اردو نویسی پر مجھ کو تعجب ہوتا ہے۔ آپ کو شاید دکھا سکوں۔ (خط مکتوبہ ۵؍مئی ۱۹۰۸ء)

دو ہفتے بعد پھر انھیں لکھتے ہیں:

آپ جانتے ہیں بمبئی میں کسی کو اردو سے مس نہیں۔ عورتیں جو کچھ سیکھتی ہیں، وہ مردوں سے سیکھتی ہیں؛ ان عورتوں کو اردو داں کہاں ملتے ہیں؟ باوجود اس کے نہایت بےتکلف صحیح اردو لکھتی ہیں، لطف یہ کہ ان کے مردوں کے خط آتے ہیں وہ بالکل بمبئی کی خالص اردو ہوتی ہے۔ (خط مکتوبہ ۱۹؍مئی ۱۹۰۸ء)

عطیہ کو لکھتے ہیں:

تم خود اردو میں کیوں نہ لکھو؟ یہ خیال غلط ہے کہ تم اردو میں عاجز ہو۔ عطیہ خویشتن را بشناس [عطیہ اپنے آپ کو پہچانو]۔ (خط مکتوبہ ۱۵؍جولائی ۱۹۰۹ء)

حواشی

۱۔ اردو میں عطیہ فیضی کے حالات سلسلہ وار تاریخی ترتیب میں کہیں نہیں ملتے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا تھا، انھوں نے شخصی خاکے یا وفیاتی مضامین کی شکل میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ایسے تین مضامین میری معلومات میں ہیں:

(i) عطیہ بیگم فیضی، رئیس احمد جعفری، مشمولہ دید و شنید، (لاہور: مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۴۸ء)

(ii) عطیہ فیضی، ماہرالقادری، مطبوعہ ماہنامہ فاران، کراچی، مارچ ۱۹۶۷ء، مشمولہ یادِ رفتگاں، ج/۲، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۹۲ء

(iii) عطیہ بیگم فیضی، نصراللہ خاں، مشمولہ کیا قافلہ جاتا ہے، (کراچی: مکتبہ تہذیب وفن، سنہ ندارد) بعد میں بھی چند مضامین لکھے گئے، لیکن ان میں پیش کردہ معلومات کا ماخذ یہی اوّلین مضامین ہیں۔ البتہ ایک مضمون پروفیسر عبدالستار دلوی کا بعنوان اقبال اور عطیہ بیگم فیضی (نئی کتاب دہلی، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء) شائع ہوا تھا، جو کوائفِ عطیہ کے لحاظ سے قدرے معلوماتی ہے، لیکن کمپوزنگ میں اس میں سنین کی اغلاط ہوگئی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب عطیاز جرنیز (Atiya's Journeys) ہے جسے ہم نے بنیادی ماخذ کے طور پر پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ، وہ قابلِ حصول تحریریں جو عطیہ کے سلسلے میں کتابوں اور رسالوں یا نیٹ پر نظر سے گزریں، ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۲۔ حسن علی کے ایک ہم نام، ماہرِ تعلیم، ترکی نژاد حسن علی آفندی (۱۸۳۰ء۔۱۸۹۵ء) بھی تھے، جنھوں نے کراچی میں پہلا مسلم تعلیمی ادارہ ۱۸۸۵ء میں 'سندھ مدرسۃ الاسلام' کے نام سے قائم کیا تھا۔ بعد میں اس نے کالج کی شکل اختیار کرلی۔ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح (ف ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء) اسی ادارے میں زیرِ تعلیم رہے تھے۔

۳۔ شبلی نعمانی، سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص۱۱۳، ۱۱۴۔

۴۔ عطیہ فیضی، صبحِ اُمید، بمبئی، اپریل ۱۹۵۹ء۔

۵۔ دراصل حسین حبیب آفندی، ہندوستان میں ترکی کے سفیر تھے۔ (حیاتِ شبلی: ۲۰۷) بعد میں یہ ترکی میں پولس کمشنر بنادیے گئے۔ شبلی نے اپنے سفرنامے میں سات جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی ضیافت تعاون اور تعلق کو عطیہ نے اپنے والد سے متعلق کرکے دیکھا ہے، جو غلط ہے۔ نیز ماہر القادری، یادِ رفتگاں، ج ۲، ص ۱۴۳۔

۶۔ ۷ر نومبر تا ۹ر دسمبر ۱۹۰۸ء کی درمیانی مدت میں عطیہ فیضی کی والدہ امیرالنسا بیگم کا وصال ہوا۔ زہرا کے نام ۹ر دسمبر کے خط میں اظہارِ تعزیت کیا گیا ہے۔ شبلی نے زہرا کی فرمائش پر تاریخی قطعے کی صورت میں مرثیہ نما ایک نظم لکھی جو زہرا کے نام خط نمبر ۲۲ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امیرالنسا، بدرالدین طیب جی کے برادرِ کلاں شجاع الدین کی بڑی بیٹی تھیں۔ نثر و نظم دونوں کے لکھنے پر قادر تھیں۔ امیرؔا تخلص تھا۔ انگریزی، عربی، فارسی، مراٹھی اور اردو سے بخوبی واقف تھیں۔ زہرا بیگم فیضی نے ان کے دو مجموعۂ کلام مرتب کرکے شائع کیے، جو میری نظر سے نہیں گزرے:

(i) یادگارِ امیرؔا، مطبوعہ مطبع قدسی، دہلی، ۱۹۳۵ء

(ii) آمین، مطبوعہ مطبع المطابع، دہلی، ۱۹۳۵ء

بیگم جنجیرہ کے حالات میں انھیں کسی انگریزی ناول کا مترجم بھی لکھا گیا ہے اور اس کا نام 'نادر بیان' لکھا ہے۔

(مشمولہ ادیب الٰہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء) میں اس کے مطبوعہ ہونے کی تصدیق نہیں کرسکا۔ صاحب آثارِ شبلی نے ان کا سالِ پیدائش ۱۸۴۹ء اور وفات کا سنہ ۱۹۰۹ء لکھا ہے۔ سالِ وفات غلط ہے۔ (ص:۶۲۸) ماہنامہ عصمت دہلی (مارچ ۱۹۲۹ء) میں ان کے ایک تاریخی مضمون بعنوان سلطانہ عائشہ بیگم کی قسط نظر سے گزری، جو ان کی وفات کے بعد زہرا نے شائع کرائی تھی۔ نازلی رفیعہ سلطان بیگم نے اپنی کتاب سیرِ یورپ کا انتساب اِنھی کے نام کیا ہے۔ عطیہ کے شوہر فیضی رحمین نے امیرالنسا کا ایک پورٹریٹ بنایا تھا، جو موہٹّہ پیلس میوزیم، کراچی میں موجود ہے۔ عطیاز جرنیز کے صفحہ ۲۴ پر اس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔

۷۔ عطیہ کے سالِ پیدائش اور مقامِ پیدائش میں اختلاف ہے۔ ماہرالقادری نے ۱۸۸۱ء لکھا ہے۔ (یادِ رفتگاں ج/۲ ص:۱۴۳) اور ان کی عمر ۸۶ سال لکھی ہے۔ قبر پر لگے کتبے میں عمر ۸۰ سال کندہ ہے۔ (خفتگانِ کراچی:۹۴) جس کے مطابق ان کی پیدائش کا سنہ ۱۸۷۷ء درست قرار پاتا ہے۔ تذکرۂ ماہ و سال (ص:۲۷۶) کے اندراج کو متعدد صورتوں میں درست پاتے ہوئے اسی تاریخ کو اختیار کرلیا گیا۔ وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان (ص:۳۰۹) میں بھی کتابچہ ایوانِ رفعت کراچی کے حوالے سے یہی تاریخ درج کی گئی ہے۔ جہاں تک مقامِ پیدائش کا تعلق ہے، بعض لوگ ان کی پیدائش ہندوستان میں بتاتے ہیں، لیکن اس کی سند نہیں۔

۸۔ سیّد شہاب الدین دسنوی نے بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے: ''لندن میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایک ہوسٹل میں داخل کرائی گئیں، لیکن کچھ عرصہ بعد انھیں ہوسٹل چھوڑنے کا حکم ملا، کیوں کہ وہ اپنے کلچرل اور سوشل مشاغل کی خاطر اکثر ۹ بجے شب کے بعد باہر رہا کرتی تھیں اور ہوسٹل کے قاعدے کے مطابق اس کی اجازت نہیں تھی۔'' (شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں:۵۶)

۹۔ عطیہ نے اپنے مضمون مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی میں ملاقاتوں کی جو ترتیب رکھی ہے، اس کے مطابق ان کی پہلی ملاقات لکھنؤ میں مشیر حسین قدوائی کے یہاں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ (شبلی نامہ :۲۶۱) لیکن یہ درست نہیں۔ ان کی پہلی ملاقات بمبئی میں اس وقت ہوئی، جب شبلی نے انھیں خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، راقم الحروف کا مضمون مولانا شبلی کا سفرِ جنجیرہ (آجکل دہلی، دسمبر ۲۰۱۵ء)

۱۰۔ محمد اسلم، خفتگانِ کراچی، ص۹۴۔

۱۱۔ *Atiya's Journeys*، ص ۴۱۔

۱۲۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ عطیہ نے یہ مضمون اردو میں لکھا تھا یا انگریزی میں۔ اسی دوران روزنامہ ڈان (اجرائے کراچی ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء) سے اخذ کرکے اس کا اردو ترجمہ قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوا۔ قومی آواز کا تراشہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ (کال نمبر۔ تذکرۂ عام ۸۴۷) لائبریری کارڈ پر اسے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء کے درمیان کی تحریر بتایا گیا ہے۔ یہی مضمون ماہنامہ آہنگ کراچی میں بھی شائع ہوا۔ اسی اشاعت سے اخذ

کر کے ہفت روزہ ریـــــاســـــت دہلی، ١٣۔٢٠/نومبر ١٩٥٠ء میں شائع ہوا۔ بیگم زیب النسا حبیب اللہ (ف ٢٠٠٠ء) کے انگریزی رسالے Mirror میں بھی یہ شائع ہوا۔ اسی سے اردو ترجمہ رئیس احمد جعفری نے کیا جو ماہنامہ صبحِ امید بمبئی، اپریل ١٩٥٩ء میں طبع ہوا۔ یہ ترجمہ ریـاسـت میں شائع شدہ مضمون سے قدرے مختلف ہے۔ شبلی معاصرین کی نظر میں ازظفر احمد صدیقی میں اسے ریاست کے حوالے سے شامل کیا گیا ہے۔ ہم نے جا بجا اسی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔

١٣۔ محمد اسلم، محولۂ بالا۔

١٤۔ *Atiya's Journeys*، ص ٤١۔

١٥۔ مشمولہ ماہنامہ آجکل، دہلی، مارچ ٢٠١٦ء

١٦۔ ماہنامہ شاعر، بمبئی، اقبال نمبر، ص ٥٣٤۔

١٧۔ *Atiya's Journeys*، ص ٩

١٨۔ جنجیرہ کا قدیم نام 'جزیرۂ حبشان' تھا۔ (دانش ورِ جنجیرہ بابا مدرس: ١٣٢) یہ ایک جزیرہ تھا، جس پر افریقی النسل حبشیوں نے قبضہ کر کے ایک آزاد دیسی ریاست قائم کر لی تھی جو تاریخ میں 'ریاست جنجیرہ' سے موسوم ہوئی۔ یہ ریاست بمبئی شہر سے شمال کی جانب ٤٠ میل (٦٤ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس کی معروف بندرگاہ شری وردھن تھی اور اس کا دارالحکومت 'مُرڈ' (Murud) تھا۔ ١٨٨١ء میں اس ریاست کا رقبہ علاوہ جعفرآباد کے ٣٢٤ مربع میل (٨٣٩ کلومیٹر) تھا۔ ١٨٩١ء میں اس کی آبادی ٨١،٧٨٠ نفر پر مشتمل تھی۔ ١٨٩٧۔٩٨ء میں ریاست کی کل آمدنی ٥،٠٩،٧٥٠ روپے تھی، جس میں رفاہی کاموں میں ٦٠،٧٠٤ روپے خرچ کیے گئے تھے۔ ١٩٠١ء میں ریاست میں ٦٠ اسکول ٣٧٠٩ طلبہ اور ١٣٥ حفاظتی خدمت گار (فوجی جوان) تھے۔ ریاست کا عمومی کاروبار بمبئی اور قرب و جوار کی ریاستوں کو مچھلی، لکڑی اور ملاح فراہم کرنا تھا، جس کے سبب ریاست میں بڑی خوش حالی تھی۔ ریاست کے پاس خود اپنے اسٹیمر تھے، جو بمبئی آمد و رفت کے کام میں آتے تھے۔ ریاست میں تین قلعے تھے۔ قلعۂ جزیرۂ محروسہ (تعمیر ١١١٦ھ/١٧٠٤ء) قلعۂ پدم درگ (تعمیر اواخر ١٦٩٠ء) اور قصر احمد یا نواب محل (تعمیر ٧۔١٩٠٦ء بعض کے نزدیک ١٨٨٥ء) قصر احمد، 'مُرڈ' کا قلعہ کے نام سے بھی معروف تھا، جہاں حکمراں قیام کرتے تھے۔ دارالحکومت مرد کی آبادی ٥.٨٨٣، نفر پر مشتمل تھی۔

جنجیرہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ایک افریقی سوداگر نے (جو احمد نگر سلطنت کا ماتحت تھا) ١٤٨٩ء میں اس پر قبضہ کر کے آزاد حکومت قائم کر لی۔ ١٧٥٩ء میں جنجیرہ کے حکمراں نے جعفرآباد (گجرات) کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا، جو شمال مغرب میں جنجیرہ سے ٣٢٠ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اگلے دو سو برس تک یہ ریاست مع جعفرآباد (رقبہ ٤٢ مربع میل یعنی ١٠٩ مربع کلومیٹر) بیجا پور اور مغل حکمرانوں کے ماتحت رہی۔ یہاں کے حکمراں خود کو وزیر لکھتے تھے۔ بعد میں یہ نواب لکھنے لگے۔ یہ جگہ ١٨٧٠ء تک برٹش حکومت کے زیر اقتدار نہیں آئی تھی۔ بعد میں برٹش حکومت نے ریاست جنجیرہ کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا اور اسے خراج سے مستثنٰی قرار دیتے ہوئے بمبئی

پریسیڈینسی (Bombay Presidency) کے ماتحت کر دیا۔ یہاں کے حکمرانوں کو 'خاں' کا خطاب اور KCIE کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور انھیں گیارہ توپوں کی سلامی کا حق دار قرار دیا گیا۔ آزادی کے بعد ٨/مارچ ١٩٤٨ء کو دوسری ریاستوں کی طرح اس کا بھی انضمام ہو گیا۔ (دیکھیے: انسائیکلو پیڈیا بر ٹینکا ج/٢٩، ص ٦٦٩، جزیرہ کی بازیافت ص: ١٥، ٣٧، یاد گار دربار: ٣٦٤، ٥٧٧)

١٩۔ سیدی (سی دی بر وزن بیوی) یہ حبشی النسل ہونے کی خاندانی علامت ہے؛ یعنی سوڈان کا باشندہ، سوڈانی۔ اسے سیّدی بروزن فرّخی پڑھنا غلط ہے۔ یاد گار دربار میں نواب جنجیرہ کے نام کے ساتھ سیدی کی جگہ لفظ شیدی استعمال کیا گیا ہے (ص: ٥٧٧)، ممکن ہے یہ مراٹھی تلفظ ہو۔

٢٠۔ نازلی کے کتبے پر ہجری تاریخ ٢٦ جمادی الآخر ١٣٨٨ھ کندہ ہے، جو مطابق ہے ٢٠/ستمبر کے، لیکن مؤلف خفتگان کراچی نے ١٨/ستمبر لکھی ہے۔ (ص ٩٥) گمان ہے کہ کتبے پر ٢٤ تاریخ رہی ہوگی، اندراج میں غلطی سے ٢٦ درج ہو گئی، کیوں کہ وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان میں اخبار جنگ کراچی، ١٩/ستمبر کے حوالے سے نازلی کی تاریخ وفات ١٨/ستمبر ہی لکھی گئی ہے، یہی درست ہے۔

٢١۔ *Atiya's Journeys*، ص ٢٦۔

٢٢۔ ایضاً، ص ٢٢۔

٢٣۔ اقبال اور بمبئی، ص ١٠٣۔٩٤۔

٢٤۔ تینوں بہنوں کے نام یہ ہیں: Charlotte (1816-1855)

Emily (1818-1848)

Anne (1820-1849)

٢٥۔ شبلی، سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص ١١٤

٢٦۔ ان تاریخوں کے تعیین کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون شبلی کا سفر جنجیرہ، آجکل دہلی، دسمبر ٢٠١٥ء

٢٧۔ شبلی معاصرین کی نظر میں، ص ١٧٧، ١٧٨۔

٢٨۔ ایضاً، ص ١٧٨

٢٩۔ مراد ہیں، محمد فیاض خاں ممبر کونسل جے پور، و رئیس پہاسو ضلع بلند شہر یو پی۔ انھیں دہلی دربار کے موقع پر 'ممتاز الدولہ' کا خطاب ملا تھا۔ (یاد گار دربار: ٣٦٦) لیکن 'پنجاہ سالہ تاریخ' (بدایوں ١٩٣٨ء) میں 'ممتاز الدولہ' لقب محمد مکرم علی خاں رئیس پہاسو، ضلع بلَند شہر کے نام کے ساتھ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (ص: ٢٣١) نہیں کہا جا سکتا کہ عطیہ کی تحریر میں کون سی شخصیت مراد ہے۔

٣٠۔ مشیر حسین قدوائی، گدیہ ضلع بارہ بنکی کے تعلقہ دار تھے۔ ١٩٠١ء میں وہ لندن چلے گئے۔ ١٩٠٧ء کے قریب بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ (شذرات الندوہ، ستمبر ١٩٠٧ء) اسی دوران ندوہ کے ارکانِ جدید

میں انھیں شامل کرلیا گیا۔شبلی نے نومبر ۱۹۰۷ء کے شذرات میں لکھا: مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی جو ابھی حال میں ولایت سے تعلیم پاکر آئے ہیں، ان کی قابلیت اور روشن خیالی، مذہبی ہمدردی محتاجِ اظہار نہیں۔ ندوہ کے ساتھ ان کو محبت نہیں عشق ہے اور اب موقع حاصل ہوا ہے کہ ان کے جوشِ ہمدردی کے آثار عملی صورت میں نظر آئیں۔ (شذراتِ شبلی :۷۸) کچھ مدت لکھنؤ میں رہے۔۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک لندن میں قیام کیا؛ ۱۹۰۲ء کے اوائل میں پھر واپس لکھنؤ آگئے۔ انھیں انگریزی زبان میں تحریر وتقریر پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزی میں متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں، اکثر کا موضوع اسلام یا مسلمان رہا۔ان کی آخری کتاب اسلام اور بالشوزم ہے۔ وہ قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔مسلم تنظیموں اور حکومت کے درمیان معاملات کو بنانے میں بھی وہ رابطے کا کام کرتے تھے۔ ۸رجنوری ۱۹۰۸ء کے انڈین ٹیلی گراف لکھنؤ میں مراسلہ لکھ کر انھوں نے ہی پہلی مرتبہ حکومت کو ندوہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا تھا۔ (حیاتِ شبلی: ۴۷۷)

ندوہ اور شبلی سے انھیں جذباتی تعلق تھا۔'خاتون منزل' (گولہ گنج) لکھنؤ میں مدرسے کے قیام کے بعد اِسی خاتون منزل میں ۴ر اکتوبر ۱۸۹۸ء کو مدرسے کے اعلان کا جلسہ ہوا، جس میں دوسرے معزّزین شہر کے ساتھ قدوائی بھی شریک تھے۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ندوہ سے حیدرآباد کے لیے جو وفد ترتیب دیا گیا تھا اس میں بھی ان کا نام تھا۔ (خط بنام شروانی ۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۷ء) ندوۃ العلما کے سنگِ بنیاد کے جلسے (منعقدہ ۲۸رنومبر ۱۹۰۸ء) میں انگریز گورنر کو جو عربی میں سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا، اسے انگریزی میں ترجمہ کرکے جلسے میں انھوں نے ہی پڑھ کر سنایا تھا، جس پر گورنر موصوف نے بالخصوص ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھیں ندوہ کی رکنیت بھی حاصل تھی۔ ۲۹ر اکتوبر کو جب نواب جنجیرہ کی دعوت پر شبلی جنجیرہ پہنچے تو مشیر حسین قدوائی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت، جس کی نمائندگی سیّد سلیمان ندوی کر رہے تھے، اس میں قدوائی ساتھ تھے۔ ان کے کوائف دستیاب نہیں۔ سیّد صاحب نے حیاتِ شبلی میں آدھے صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے (ص:۴۷۷) جو ان کی خدمات کے لحاظ سے ناکافی ہے۔ ان کی وفات کے بعد معارف جنوری ۱۹۳۸ء میں بھی ان پر وفیاتی کالم لکھا (مشمولہ یادِ رفتگاں ص:۱۸۱) سیّد صاحب نے وفات کے وقت ان کی عمر ۵۹ برس لکھی ہے، اس اعتبار سے وہ ۱۸۷۸ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی وفات ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔ (یاد رفتگاں ص:۱۸۱)، حیاتِ شبلی (طبع اول) میں غلطی سے سالِ وفات ۱۹۳۰ء چھپ گیا ہے اور طبع جدید میں ۱۹۲۰ء (ص:۴۶۳)

قدوائی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ۱۹۳۶ء کی ''فہرست کتب صدیق بک ڈپو لکھنؤ'' (مرتبہ چودھری محمد نعیم وعبدالرشید۔ دہلی، ۲۰۱۶ء) میں ان کے دو دیوان: نالۂ مشیر، کلامِ مشیرؔ اور ایک منظوم خط 'نامۂ مشیرؔ' کا اندراج ملتا ہے، اسی فہرست میں ان کی چھے (۶) نثری کتابوں کے نام بھی نظر سے گزرے: تعلیمِ نسواں، حقیقی ترقی، ذکرِ طیب، محمدؐ عربی، مرتبۂ نسواں اور مشیرؔ۔ تعلیمِ نسواں کے عنوان سے مطبوعہ رسالہ غالباً اُس مضمون پر مشتمل ہے جس کی اشاعت پر عطیہ نے شبلی سے برہمی کا اظہار کیا تھا، اور

بعد میں انگریزی میں اس کا جواب بھی لکھا تھا۔

۳۱۔ مسز سروجنی نائیڈو (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۹ء) کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے، جنھوں نے مغرب میں تعلیم حاصل کرکے ہندوستان میں اس کی روشنی کو پھیلانے کی تدابیر اختیار کیں۔ وہ انگریزی کی شاعرہ اور ادیب ہی نہیں اچھی مقررّہ بھی تھیں۔ انگریز حکومت نے انھیں 'قیصر ہند' کے طلائی تمغے سے سرفراز کیا تھا۔عطیہ کے کافی قریب تھیں۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں جب شبلی جنجیرہ گئے تو وہ بھی وہاں موجود تھیں۔

۳۲۔ شبلی نامہ، ص ۱۵۸۔

۳۳۔ امیر خسرو سے منسوب معروف شعر:

حسنِ یوسف، دمِ عیسی، یدِ بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے مصرعۂ ثانی میں تغیر کرکے استعمال کیا ہے۔

۳۴۔ اس مضمون کے دو الگ ترجمے ہیں، دونوں میں یہاں عبارتیں مختلف ہیں۔ یہ دونوں ترجمے ظفر احمد صدیقی کی تازہ تالیف شبلی شناسی کے اوّلین نقوش (دارالمصنّفین اعظم گڑھ، جنوری ۲۰۱۶ء) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ پہلا ترجمہ متداول ہے۔ رئیس احمد جعفری کا ترجمہ پہلی مرتبہ متعارف ہوا ہے۔

۳۵۔ نصراللہ خاں نے اپنی کتاب کیا قافلہ جاتا ہے میں عطیہ پر مضمون لکھتے ہوئے اس واقعے پر خاصی حاشیہ آرائی کی ہے۔ دیکھیے ص:۱۱۶، ۱۱۷

۳۶۔ صحیح شعر اس طرح ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ۔۔۔ سن رکھو تم، فسانہ ہیں ہم لوگ

(نور الاسلام منتظرؔ لکھنوی تلمیذ مصحفی)

۳۷۔ بہن جان سے مراد نازلی بیگم ہیں۔

۳۸۔ مراد زہرا فیضی۔

۳۹۔ اردو میں اسے مجگاؤں لکھا جاتا ہے۔ عطیہ نے انگریزی تلفظ کے مطابق مزگاؤں لکھا ہے۔

مآخذ

۱۔ اسلم، محمد، خفتگانِ کراچی، لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ ______، وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء۔

۳۔ اعظمی، محمد الیاس، آثارِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۴ء۔

۴۔ اکرام، شیخ محمد، شبلی نامہ، بمبئی، تاج آفس، سن ندارد۔

۵۔ بدایونی، شمس، مولانا شبلی نعمانی کا سفرِ جنجیرہ، مشمولہ آج کل، دہلی، دسمبر ۲۰۱۵ء۔
۶۔ جعفری، رئیس احمد، دید و شنید، لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۴۸ء۔
۷۔ خان، نصراللہ، کیا قافلہ جاتا ہے، کراچی: مکتبہ تہذیب و فن، ۱۹۸۴ء۔
۸۔ دسنوی، سیّد شہاب الدین، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۷ء۔
۹۔ دلوی، عبدالستار، اقبال اور عطیہ فیضی، مشمولہ نئی کتاب، دہلی، اپریل، ستمبر، ۲۰۱۲ء۔
۱۰۔ شبلی نعمانی، سفرنامۂ روم و مصر و شام، دہلی، قومی پریس، ۱۳۳۵ھ۔
۱۱۔ شرما، سنیل، (Sharma, Sunil) اور لیمبرٹ ہرلی، سیوبھان، (Lambert-Hurley, Siobhan), *Atiya's Journeys: A Muslim Woman from Colonial Bombay to Edwardian Britain*، اوکسفرڈ، ۲۰۱۰ء۔
۱۲۔ ماہرالقادری، یادِ رفتگاں، ج ۲، دہلی: مرکزی اسلامی کتب خانہ، ۱۹۹۲ء۔
۱۳۔ ندوی، سیّد سلیمان، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۳ء۔